حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کا مجاہدانہ تصوّف

مولانا سیّد احمد عروج قادری

حضرت شیخ کی ولادت علاقہ گیلان کے مقام نیف میں ۴۷۰ھ میں ہوئی۔ وہ خلیفہ عباسی مقتدی بامر اللہ کا عہد حکومت تھا۔

۴۸۸ھ میں آپ بغداد پہنچے۔ اس وقت عمر ۱۸ سال تھی۔ ایک طرف شیعیت، اعتزال، فتنۂ خلقِ قرآن اور باطنیت کی تحریکیں خطرہ ایمان بنی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف علمائے سُو اور مکار صوفی لوگوں کے جان و مال اور اُن کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈال رہے تھے۔ حرام خوری و بدکاری اور منافقت کی گرم بازاری سے بغداد جل رہا تھا۔

حضرت شیخ گیلانیؒ ۴۹۶ھ میں اپنے مدرسے سے تمام مروجہ علوم و فنون میں کامل ہو کر نکلے۔ شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس کی صحبت میں احسان و سلوک کی تربیت حاصل کی اور پھر قاضی ابوسعید مخزمی سے اس کی تکمیل کی۔

دعوتی و اصلاحی سرگرمیاں

کتاب و سنت کے علوم و فنون سے مسلح مزاجِ شریعت سے آشنا اور اصلاح و تقویٰ سے آراستہ ہو کر آپ میدانِ جہاد میں اُترے۔ تین محاذوں سے باطل کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ دعوتی اجتماعات، مدرسہ، مجالسِ ارشاد و تربیت۔

آپ کو الگ سے کوئی نیا مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اپنے استاد شیخ ابوسعید مخزمی کے مدرسے میں آپ نے مسندِ صدارت کو زینت بخشی اور

ابتداءً وہیں دعوت الی الحق کے اجتماعات بھی منعقد کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس و تدریس اور آپ کی تقریروں میں وہ اثر بخشا کہ کچھ دنوں میں طلبہ و سامعین کی کثرت کے سبب سے مدرسے کی عمارت ناکافی ہوگئی اور اس کی توسیع عمل میں آئی لیکن بسا اوقات دعوتی اجتماعات کے لیے وہ بھی ناکافی تھی۔ چنانچہ تقریر کے لیے شہر سے باہر وسیع میدان میں منبر رکھا جاتا تھا۔ سامعین کی تعداد کبھی کبھی ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ چار سو اشخاص آپ کے مواعظ و خطبات قلم بند کیا کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ چالیس سال جاری رہا۔ دعوتی و اصلاحی تقریریں ہفتے میں تین بار ہوا کرتی تھیں۔ ایک اہم اور معنی خیز بات یہ تھی کہ آپ اپنی تقریر کی تمہید میں ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ کی آیت تلاوت فرماتے تھے اور امام وقت کی اصلاح کی دعا بھی کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں آپ کی جدوجہد کے مقصد کو واضح کرتی ہیں۔

کوئی دین اور کوئی نظامِ زندگی، سیاسی اقتدار کی اصلاح کے بغیر کماحقہٗ نافذ نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت خلافتِ عباسیہ کا سیاسی اقتدار کمزور بلکہ برائے نام تھا اور عام طور سے خلفاء اپنے عیش و عشرت میں مگن تھے۔ ہمہ جہتی اصلاح کی کوئی جدوجہد کامیاب نہ ہو سکتی تھی جب تک سیاسی اقتدار مستحکم اور سلطانِ وقت خود صلاح و تقویٰ سے آراستہ نہ ہو۔ حضرت الشیخ کے علم و بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔

خلیفۂ وقت کی اصلاح

پھر یہ بھی نہیں ہے کہ خلیفۂ وقت کی اصلاح کے معاملے میں آپ نے کبھی بے جا لینت و نرمی، خوشامد اور چاپلوسی کی روش اختیار کی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ سلطانِ وقت کی غلط حرکتوں پر سختی کے ساتھ علی رؤس الاشہاد ٹوکتے تھے اور آپ کے پُراثر کلام، پُرتاثیر شخصیت، اخلاص، دردمندی، بے نفسی اور بے غرضی کا یہ اثر تھا کہ بے نظیر قبولیت عامہ کے باوجود کبھی کسی خلیفہ نے آپ پر ٹیڑھی نگاہ نہ ڈالی۔ تاریخ میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

کان یامر بالمعروف و ینھیٰ عن المنکر للخلفاء والوزراء والسلاطین والقضاۃ والخاصۃ والعامۃ یصدعھم بذالک علیٰ رؤوس الاشھاد ورؤوس المنابر وفی المحافل وینکر علیٰ من یولّی الظلمۃ ولاتاخذہ فی اللہ لومۃ لائم۔

"آپ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے تھے۔ خلفاء کو، وزیروں کو، قاضیوں کو، خواص کو، عوام کو، سب کو، اور یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بڑی صفائی کے ساتھ بھرے مجمع میں اور برسر منبر ہوتا تھا، جو خلیفہ کسی ظالم کو حاکم بناتا آپ اس پر انکار کرتے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت آپ کو حق کے اظہار سے نہ روکتی۔"

اس عبارت میں "یصدعھم" کا تلمیح ہے۔ قرآن کی آیت فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (اے نبیؐ تمھیں جو حکم دیا جارہا ہے اُسے کھول کر بیان کرو) کی طرف اس عبارت سے صراحتہً آپ کی ہمہ جہتی سعی اصلاح کا پتہ چلتا ہے۔ کوئی طبقہ البسا نہ تھا جو آپ کے دائرۂ اصلاح سے باہر ہو۔

ایک بار خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفا یحییٰ بن سعید کو جو ابن المزجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا۔ بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ جب حضرت شیخ کو اس کی خبر ملی تو برسرِ منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے کہا:

ولّیت علی المسلمین اظلم الظلمین فما جوابک غداً عند ربّ العٰلمین ارحم الرّاحمین۔

"تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص بنایا جو اظلم الظالمین ہے۔ یعنی بہت بڑا ظالم ہے۔ کل قیامت میں رب العالمین کے سامنے کیا جواب دو گے جو ارحم الراحمین ہے، سب سے زیادہ مہربان ہے"۔

تاریخ کہتی ہے کہ یہ بلیغ جملے سن کر خلیفہ لرز اٹھا، رونے لگا اور اسی وقت اس قاضی کو اس عہدے سے معزول کر دیا۔ آپ کی مجالسِ وعظ میں وزراء، نقیب النقباؒ

اور نائبینِ سلطنت بھی شریک ہوتے تھے اور یہ وہ لوگ تھے کہ بعض اوقات ان کا اقتدار خلیفہ سے بھی بڑھ جاتا تھا لیکن ان کو نصیحت کرنے میں بھی آپ نرمی نہیں برتتے تھے، ان میں سے کتنے ہی آپ کے زجروتوبیخ کا شکار ہوئے۔ ایک بار خلیفہ کے قصور و محلات کا ناظم عزیزالدین آپ کی مجلس میں اپنے حشم و خدم کے ساتھ آیا۔ مجلس میں آنے کا پہلا اتفاق تھا، اس کے آتے ہی آپ نے اپنی تقریر کا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا۔

آپ نے فرمایا: "تم سب کی حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی خدمت کرتا ہے، اللہ کی خدمت کون کرتا ہے"؟ اس سوال کے بعد آپ نے طویل نصیحت کی اور آخر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

> "کھڑا ہو، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے تاکہ اس اُجاڑ گھر یعنی دُنیا سے بھاگ کر رب کی طرف لپکیں اور اللہ کی طرف اور عمل کی طرف چلیں، عنقریب تجھ کو حق کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اور وہ تجھ سے تیرے اعمال کی باز پُرس کرے گا"۔ (فیوض یزدانی ص ۵۰۰)

ایک موقع پر آپ سے درخواست کی گئی کہ کلام میں اگر اتنی سختی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

> "میل جم گیا ہے اور جب تک اس کو زور سے نہ ملا جائے وہ دُور نہ ہوگا"

یہ کتنا بلیغ، معنی خیز اور دُور رس جواب ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس جواب کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اِن شاء اللہ میرا کلامِ سخت ان کے لیے آبِ حیات کا کام کرے گا۔ اور انہیں حیاتِ تازہ عطا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کی سخت تنقیدیں بہتوں کے لیے آبِ حیات ثابت ہوئیں۔ درباری علماء

اور مشائخ کے مقابلے میں بھی آپ کے تیز و تند کلام کی یہی مصلحت تھی رہیہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہر داعی یہ روش اختیار کر سکتا ہے، اس کے لیے موقع شناسی شخصیت اور وہ صفات درکار ہیں جو حضرتِ شیخ میں تھیں۔ ایک بار مجموعی طور پر اپنی سخت کلامی کا سبب اپنی تقریر میں یوں بیان فرمایا:

"میرا وعظ کے لیے منبر پر بیٹھنا تمہارے قلوب کی مصلحتوں اور اُن کو سنوارنے کے لیے ہے نہ کہ تقریر میں اُلٹ پھیر کرنے اور اس کو سنوارنے کے لیے۔ میری سخت کلامی سے بھاگو مت۔ کیونکہ میری تربیت اُس نے کی ہے جو دینِ خداوندی میں سخت تھا۔ میری تقریر بھی سخت ہے اور کھانا بھی سخت اور روکھا سوکھا ہے بس جو مجھ سے اور مجھ جیسے لوگوں سے بھاگا، اُس کو فلاح نصیب نہیں ہوئی، باتوں کا تعلق دین سے ہے، اُن کے متعلق جب تو بے ادب بنے گا تو میں تجھ کو چھوڑوں گا نہیں، اور یہ نہ کہوں گا کہ اس کو کیے جا۔ تو میرے پاس آئے یا نہ آئے میں پروا نہ کروں گا۔ میں قوت کا خواہاں خدا سے ہوں نہ کہ تم سے۔ میں تمہاری گنتی اور شمار سے ایک طرف ہوں"۔ (ص ۲۷۳)

احیائے اسلام کی تڑپ آپ کی زندگی کے اصل کارنامے کی ایک دلیل آپ کا لقب "محی الدین" بھی ہے۔ اگر آپ کی احیائے دین کی جدوجہد نمایاں نہ ہوتی اور اگر آپ کا کوئی امتیازی وصف نہ ہوتا تو پھر یہ لقب بے معنی ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مظلومیت نے آپ کو آتشِ زیرپا بنا دیا تھا اور آپ دین کو پھر سے غالب کرنے کے لیے ہمہ تن مصروفِ جہاد ہو گئے تھے۔ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں۔ اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے، اے باشندگانِ زمین! آؤ اور جو گر گیا ہے اُس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اُس کو درست کر دیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی۔ سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ اے سورج اور اے چاند اور اے دن تم سب آؤ"۔ (ص ۴۹۸)

اِس مختصر سے ملفوظ میں احیائے اسلام اور اقامتِ دین کے لیے کتنی تڑپ، کتنا سوز، اور کتنا درد چھپا ہوا ہے؟ اس کو پڑھ کر قاری کا دل ہل جاتا ہے، پکارنے والا دین کی اقامت کے لیے ساری کائنات کو پکار رہا ہے، اس سے زیادہ پُرزور اور عام دعوتِ دین اور کیا ہوگی، اس پکار میں ایک تحریک، ایک تنظیم کی دھمک محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوسرے ملفوظ میں فرماتے ہیں:

"صاحبو! اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، ان بدعتیوں، گمراہوں، اور مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظلم سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے۔" (ص ۵۰۷)

بہت سے لوگ تقدیر کو اپنی بے عملی اور احیائے اسلام کی جدوجہد سے علیحدگی کا بہانہ بناتے ہیں۔ ایک بار آپ نے اس مسئلے کو عجیب انداز میں سمجھایا۔

"ہماں بعض حالت وہ بھی ہے جو مخفی رکھی جاتی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ تقدیر کی آمد کے انتظار میں سو رہیں۔ بسم اللہ اس کے بعد آپ نے منبر پر تکیہ لگایا اور ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر اسی حالت میں رہے۔ اس کے بعد بیٹھ گئے اور فرمایا! تم بیوقوف ہو اور دیوانے ہو، تمہارا مجھ سے الگ ہو کر بلا عذر بیٹھ رہنا اصل راس المال کا نقصان ہے۔" (ص ۴۹۸)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ میں احیائے اسلام کی دعوت دے رہا ہوں اور اس کام میں معاونت کے لیے تمہیں پکار رہا ہوں اور تم تقدیر کا عذر پیش کر کے اس جدوجہد سے علیحدگی اختیار کر رہے ہو، یہ کھلی ہوئی حماقت ہے۔ اس سے تم راس المال یعنی اپنی عمر اور مہلتِ کار کو برباد کر رہے ہو۔ اس عذر کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ آ ؤ۔ کیا اب بھی شبہ باقی رہتا ہے کہ حضرت شیخ کا اصل کارنامہ کیا ہے اور آپ کی جدوجہد کا نصب العین کیا تھا؟ اس وقت بغداد میں مسلمانوں کے جتنے طبقات موجود تھے ان میں سے ہر طبقے کو آپ نے نام لے لے کر پکارا، اُن پر تنقیدیں کی ہیں۔ اور اُن تک حق کی دعوت پہنچانے کی سعی کی ہے۔ یہاں تمام تقریروں کے اقتباسات پیش کرنا طوالت کا سبب ہوگا، یہاں اس طرح کا صرف ایک

اقتباس دیا جاتا ہے جس میں آپ نے مجموعی طور پر تمام باشندگانِ بغداد کو مخاطب کیا ہے:

"اے باشندگانِ بغداد، تمہارے اندر نفاق بڑھ گیا اور اخلاص کم ہوگیا ہے۔ اقوال بڑھ گئے ہیں اور اعمال کم ہوگئے ہیں، تمہیں جاننا چاہیے کہ قول بلا عمل کسی کام کا نہیں، بلکہ وہ تمہارے خلاف حجت ہے۔ قول بلا عمل ایسا خزانہ ہے جو خرچ نہیں کیا جاتا۔ وہ محض دعویٰ ہے دلیل اور گواہ کے بغیر۔ وہ ایک ڈھانچہ ہے جس میں رُوح نہیں۔ کیونکہ رُوح تو اخلاص و توحید اور کتاب و سنّت پر عمل کرنے سے آتی ہے اور وہ تمہارے اکثر اعمال سے نکل چکی ہے۔ غفلت سے باز آؤ اور خدا کی طرف پلٹو، اس کے حکم کی تعمیل کرو اور اس کے ممنوعات سے بچو۔" (ص ۱۲۰)

یہاں تک جو تفصیل پیش کی گئی اس سے بالکل واضح ہے کہ آپ کا اصل کارنامہ احیائے اسلام کی جدوجہد ہے اور اس طریقِ زندگی کی اقامت نصب العین ہے جس کی تعلیم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ و تابعین دے گئے ہیں۔ آخر میں خود حضرت شیخ کی تصریح پیش کرتا ہوں جس سے مستند ذریعہ دوسرا موجود نہیں ہے۔

"یہ آخری زمانہ ہے کہ نفاق کا بازار رچا ہوا ہے اور میں اس طریقے کو قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہؓ اور آپؐ کے تابعین رہے ہیں۔ یہ آخری زمانہ ہے کہ لوگوں کے معبود دراہم و دنانیر بن گئے ہیں۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح بن گئے کہ اُن کے دلوں میں گوسالے کی محبت رچ گئی تھی اور اس زمانے کا گوسالہ دینار و درہم بن گیا۔ تجھ پر افسوس، تو اس دُنیا کے بادشاہ سے جاہ و مال کا طالب کس طرح بنا ہوا ہے اور اپنی مہمات میں اس پر کیسے بھروسہ کرتا ہے۔ حالانکہ عنقریب وہ یا معزول ہونے والا ہے یا مرجانے والا۔ اس کا مال و مُلک و جاہ سب جاتا رہے گا۔ اور ایک ایسی قبر میں جا بسے گا جو تاریکی و وحشت اور تنہائی و اندوہ و رنج و غم اور کیڑے مکوڑوں کا گھر ہے۔ وہ حکومت سے ہلاکت کی طرف

منتقل ہو جائے گا، لیکن اگر اس کے پاس نیک عمل اور نیک نیتی ہوگی تو حق تعالیٰ اس کو اپنی نعمت سے ڈھانپ لے گا اور حساب کتاب میں تخفیف فرمائے گا۔ جو معزول ہونے والا، مرجانے والا ہے اس پر بھروسہ مت کرو ورنہ تیری توقع نامراد رہے گی اور مدد منقطع ہو جائے گی۔" (ص ۲۰۶)

یہ تھے سیدی الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور یہ ہے اُن کا کارنامہ۔ آپ کی جدوجہد اور اس کے تمام ذرائع تجدید و احیائے اسلام کے محور و مرکز کے گرد گھومتے ہیں دعوتی اجتماعات کا منبر وعظ ہو، مدرسے کی مسندِ درس ہو یا خانقاہ کی خلوتِ تربیت۔ ہر جگہ وہی ایک مقصد تھا جو ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہا۔

آپ کی اس جدوجہد کے نتائج کیا رہے؟ اس سوال کا جواب بھی بڑا دلکش اور اطمینان بخش ہے۔ یہاں اس کی تفصیل طوالت کے خوف سے چھوڑ دی گئی۔ مختصراً اتنا لکھنا کافی ہے کہ حضرت الشیخ کی جدوجہد سے بغداد میں صلاح و تقویٰ کی ایک تازہ بہار آگئی تھی یہی نہیں کہ عوام و خواص کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی بلکہ قصرِ خلافت تک اس کے اثرات جا پہنچے تھے۔

اب ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ حضرت الشیخ کے حقیقی عقیدت مند وہ لوگ ہیں جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مشغول ہیں یا وہ لوگ جنہیں اس جدوجہد کے نام ہی سے پسینہ آتا ہے۔ اور وہ "یا غوث" کا نعرہ مار کر اور ان کی گیارھویں منا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کر دیا۔ ہم مسلمانوں کو بالعموم اور قادریوں کو بالخصوص دعوت دیتے ہیں کہ وہ اقامتِ دین اور احیائے اسلام کی جدوجہد شروع کریں جس کے لیے حضرت شیخ زندگی بھر مصروفِ عمل رہے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً وَجَزَاهُ عَنِ الْاِسْلَامِ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔